پیام اقبال Bahria Research Journal on Iqbal Studies (BRJIS)
2(2), 1-14, 2023

کلامِ اقبال میں تصورِ تخریبِ تمام

The Concept of Destruction In Kalam-E-Iqbal

Ejaz Anjum
Hazara University, Mansehra
ajazanjum060@gmail.com

Abstract

To think of the world as impermanent is just an illusion. Science and technology have clarified the concept of destruction and construction. It became clear that the inner reality of the universe is motion. Peace does not come from anything. With this movement, revolutions occur in existence. Apparently, a thing disrupts the system of existence, but what is achieved as a result is the beauty of nature. With Iqbal, this concern comes to the fore in the form of the concept of destruction for reconstruction. Man is a rebel who cannot bear to see nature in its original state for long. Human civilization is the bright gift of this destructive nature. Civilization began in rebellion against the law of nature. Civilization is to make and beautify something while destruction is to spoil. How can a relationship be established between the two? This is the point that is the essence of life's difficulties. Man made the civilizational journey from stone to bronze and from bronze to iron in three stages. When the Stone Civilization fell, the cause was the Bronze Age. That is the rise of bronze. Similarly, the decline of the Bronze Age was the rise of the Iron Age. That is, on the one hand, the deterioration and on the other hand the reconstruction. The study of the same cultural and destructive chain in the universe has been done in the light of Iqbal's thoughts for the first time in research and criticism through extensive literature review of primary and secondary work on Iqbal's philosophy.

Keywords: Iqbal, destruction, motion, reconstruction, civilization, Asrar e Khudi

کلیدی الفاظ: تخریبِ تمام، متذبذب، نگاہِ فطرت شناس، شیون، تکمیلِ جمالِ معنوی، فسکِ دم، نامیاتی، ہابیل و قابیل یفسک الدما، جہد للبقا

بحرِ اقبالیات میں غوطہ زن ہو کر غواص (محقق) فکر و فلسفہ کے نادر موتی اپنی بساط کے مطابق نکالتا ہے۔ اس وقت تک متعدد تصورات منظرِ عام پر لائے جا چکے ہیں اور عالمین کے تجربات میں آ چکے ہیں۔ تصورِ تخریب ایک اہم اور نادر تصور ہے جس کا مکمل طور پر سامنے آنا ضروری ہے۔ اقبالؒ نے اس تصور میں مشکلاتِ حیات کا حل بتایا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کہاں تک مشکلاتِ زندگانی کی کشود ہو سکتی ہے؟ اسی زاویے سے اقبالؒ کے کلام کا مطالعہ پیشِ نظر مقالے میں کیا گیا ہے۔

سابقہ تحقیقات اور درپیش مسئلہ

اس وقت تک اقبالیات پہ جو بھی کام ہوا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اپنی جگہ بالکل بجا اور لائقِ تحسین و تقلید ہے۔ دیکھا جائے تو موضوع "تصورِ تخریب" پہ اب تک کوئی ایسا مقالہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا جس میں اقبالؒ کے تصورِ تخریب پر کماحقہ بحث کی گئی ہو۔ شارحینِ اقبال نے ارمغانِ حجاز اردو میں موجود اس شعر کی سرسری تشریح ضرور کی ہے جس میں اقبالؒ نے یہ تصور دیا ہے مگر تشریح کی ہی حد تک۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اس سوچ کو پھیلانے کی غرض سے اپنی شرح میں کچھ اضافہ کیا ہے۔ مگر اس تصور کو دیگر تصوراتِ اقبالؒ کی طرح مطالعے میں نہیں لایا گیا۔ دورِ حاضر کے رجحانات کے پیشِ نظر یہ مسئلہ سر اٹھا رہا ہے کہ اس غیر متوقع دور میں انسان دلگرفتہ ہو کر بیٹھ جائے اور کارزارِ حیات سے ارادی لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے رہبانی زندگی بسر کرنے لگ جائے یا اس ہیجانی دور میں بھی اپنے فکری زاویے بالکل درست رکھتے ہوئے تضادات کے مابین اپنی شاہراہ پر گامزن رہے۔ ضروری ہے کہ کلامِ اقبالؒ کے اس پہلو پر بطورِ خاص روشنی ڈالی جائے۔ اسی مسئلے کے پیشِ نظر یہ مقالہ بعد از تحقیق قارئین کے سامنے لایا جا رہا ہے۔

مقصدِ تحقیق

زیرِ نظر تحقیقی مقالے کا مقصد جذباتِ حیات کو مجروح ہونے سے بچانا ہے۔ مشاہدۂ عام میں آ رہا ہے کہ اس ہیجانی دور میں انسان دل گیر ہو چکا ہے اور نصب العین کی تخلیق میں وہ خدشات لاحق ہیں جو اشکالِ اشیاء کے بننے بگڑنے سے پیدا ہو رہے ہیں۔ سوچ کی اس پستی کو مٹانے اور فکرِ اقبال کی روشنی میں اس بھیانک وقت کے اندر اپنے مقاصد تراشنے اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت بخشنے کے لیے یہ مقالہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔

سوالاتِ تحقیق

پیشِ نظر تحقیق ان سوالات کے جوابات کی تلاش میں تکمیل پائی ہے:

- ارضی بگاڑ کے طباعِ انسانی پہ کیا اثرات پڑتے ہیں؟
- سیاسی تضادات اور معاشرتی اتھل پتھل سے ذہنِ انسانی کیا معنی اخذ کرتا ہے اور عملی زندگی میں کیا نقصان ہوتا ہے؟
- تصوراتِ اقبالؒ کی روشنی میں تخریب کی حقیقت کو منظرِ عام پر کیسے لایا جا سکتا ہے؟
- اس تصور کی عملی صورت انسانی معاشرے میں کیا برکات لا سکتی ہے؟

طریقِ تحقیق

تحقیق کا طریقِ کار دستاویزی اور تاریخی ہے۔ تنقیدی و توضیحی انداز سے موضوع کو تکمیلی شکل دی گئی ہے۔ زیادہ توجہ کلامِ اقبالؒ اور ان عبارتوں پر مرکوز رہی ہے جن میں اقبالؒ نے قرآنِ مجید اور مظاہرِ فطرت کے مشاہدے سے اپنے تفکرات کا اظہار کیا ہے۔ شاملِ تحقیق اشعار کا توضیحی جائزہ لیا گیا ہے اور اشعار میں موجود "تصورِ تخریب" کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے شروحاتِ کلامِ اقبال اور دیگر اقبالی فلسفے پر مشتمل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ماخذات میں کلامِ اقبالؒ اور تصوراتِ اقبال کے توضیحی و تنقیدی مطالعات پر مبنی کتب شامل ہیں۔

تحدید

اقبالیات کا کوئی بھی موضوع ہو، ایک آدھ مقالے میں کامل طور پہ نہیں سما سکتا۔ اس لیے موضوع کی حد بندی ضروری ہے۔ پیشِ نظر مقالہ میں ارمغانِ حجاز اردو کی نظم "عالمِ برزخ" میں شامل ایک شعر کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اسی ایک شعر کی کامل تفہیم کی خاطر اردو اور فارسی کلام سے چند ایک شعری مثالیں پیش کی گئی ہیں۔

تصورِ تخریب کی تخریج

ماہرین اقبالیات اس وقت تک فکرِ اقبالؒ سے بیشتر تصورات سامنے لائے ہیں جن میں بعض کو خود علامہ اقبالؒ نے بطورِ تصور واضح کیا اور بعض ایسے تصورات ہیں جنھیں ماہرین نے کلام اقبالؒ سے اخذ کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بیان شدہ اور اخذ شدہ دونوں طرح کے تصورات اپنی حقیقت اور معیار کے حوالے سے بقائے دوام کی سند رکھتے ہیں۔ وقتِ موجودہ تک اقبالی فلسفہ و حکمت پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اس میں کوئی نیا پہلو دریافت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ معنوی پہلو داری ایک طرف مگر کوئی ایسا زاویہ سامنے لانا جس پر ماہرین کی توجہ مرکوز نہ ہوئی ہو جان جوکھوں کا کام ہے۔ راقم کی تحقیق کا موضوع 'ارمغانِ حجاز (اردو)' رہا ہے، اس کتاب کے عمیق مطالعے سے جہاں اقبالؒ کے بیشتر تصورات کی حقیقت معلوم ہوئی اور نئی جہتیں سامنے آئیں وہیں ایک عمدہ اور لائقِ غور تصور، جسے ایک مکمل فلسفہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا، "تخریبِ تمام" ہے۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جس سے شارحین نے صرفِ نظر برتا اور ماہرین نے بڑے تصورات کی پیچیدگیوں میں پڑ کر اس شعر کو ہی خاطر میں نہ لایا جس میں اقبالؒ نے بہ آوازِ بلند کہا ہے:

ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام
ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود [1]

یہ شعر فقط تشریح کا متقاضی نہیں بلکہ وہ تصور سامنے لانا از حد ضروری تھا جو اس میں موجود ہے۔ سادہ معنوں میں تو اقبالؒ نے یہ کہہ دیا کہ کسی نئے وجود کو معرض میں آنے کے لیے پہلے سے موجود وجود کی تخریب یا اس کا مٹنا ضروری ہے۔ آگے جا کر جب اقبالؒ نے یہ کہا کہ اسی میں مشکلاتِ زندگانی کا حل موجود ہے تو بات جاذبِ نظر بن جاتی ہے۔ واضح ہو رہا ہے کہ اقبالؒ کوئی دانائی کا نکتہ سمجھانا چاہتے ہیں۔ انسان اس بات پر پریشان ہے کہ کسی شے کا وجود مٹ رہا ہے، کسی ایسی شے کا وجود بن رہا ہے جس کے لیے ذہنِ انسانی تیار نہیں۔ نت نئے حادثات رونما ہو رہے ہیں اور یہ انسان قدیم و جدید کی کشمکش میں مبتلا کبھی ماضی پہ نوحہ کناں ہے تو کبھی حال پہ متذبذب اور مستقبل کے لیے فکر مند۔ ان مشکلات کا سامنا کیسے کیا جائے؟ اسی مشکل کی کشود اقبالؒ نے اس شعر میں بیان کی ہے۔

سوال یہ ہے کہ آخر یہ تخریبِ تمام ہے کیا؟ 'تخریب' عربی اردو اسمِ مونث ہے جس کے لفظی معنی خراب کرنا، بگاڑنا، خرابی، بربادی، تباہی اور ویرانی ہیں۔[2] یعنی جب کسی شے کی موجودہ شکل و صورت میں مکمل تبدیلی یا بگاڑ آ جائے تو یہ تخریب ہے۔ یہ تخریب کئی ایک نئی صورتوں کو جنم دیتی ہے جن میں بعض عقلِ انسانی کی تسکین ہوتی ہیں، بعض راحتِ جسمانی کا سامان بنتی ہیں اور بعض خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کی وجہ بنتی ہیں۔ انہی صورتوں میں بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جو دلخراش ہوتی ہیں اور انسانی آلام میں اضافہ کرتی ہیں۔ اقبالؒ نے تخریبِ تمام کا فلسفہ 'تعمیرِ نو' کی غرض سے پیش کیا ہے۔ 'ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام' کہ جب تک پہلا وجود مٹ نہ جائے نئی شے وجود میں نہیں لائی جا سکتی، تو ظاہر ہوا کہ تخریبِ تمام برائے تعمیرِ نو ہے، نہ کہ پہلے سے موجود تمام دائروں کو مٹا کر رکھ دیا جائے جبکہ کوئی نیا نظام وجود میں لانے کی صلاحیت ہی موجود نہ ہو۔ ردِ تشکیل اور تخریبِ تمام برائے تعمیرِ نو میں فقط یہی فرق ہے۔

اگر اس تصور کو لے کر فطرت کا مطالعہ کیا جائے تو کائنات میں ہر گھڑی تخریب و تعمیر کا سلسلہ جاری ہے۔ کئی دائرے مٹتے ہیں اور نئے وجود پاتے ہیں۔ وجودِ ہستی ہر وقت تخریب و تعمیر کی عمل سے دوچار ہے۔ علامہ اقبالؒ کی نگاہِ فطرت شناس، فطرت کے اس قانون کو سمجھ گئی کہ وجود میں تحرک ہے۔ یہی تحرک تبدیلی کی بنیاد بنتا ہے اور انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ وجودِ کائنات کے ظاہری و باطنی انقلابات دراصل دنیائے آب و گل کا وہ حیاتی پہلو ہے جو مقصودِ فطرت ہے۔ تخریبِ تمام کا یہ تصور سب سے پہلے قرآنِ حکیم نے دیا ہے۔ سائنس آج اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ یہ

کائنات ایک گولہ تھا صدیوں پہلے یہ گولہ پھٹا اور زمین و آسمان کی صورتیں سامنے آئیں۔ طبیعیات میں اسے بگ بینگ تھیوری کہا جاتا ہے۔ القرآن الکریم کا استدلال دیکھیے:

" اَوَ لَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤْمِنُوْنَ " (۳)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آسمان و زمین دونوں ملے ہوئے تھے تو ہم نے جدا جدا کر دیا۔ اب یہاں اہلِ عقل کو اشارہ ہے کہ وجود ایک تھا۔ اس میں تخریب ہوئی تو آسمان اور زمین دو الگ الگ وجود بنے۔ پھر نباتات و جمادات اور ہر مرئی و غیر مرئی شے زمین و آسمان اور اس کے درمیان وجود حاصل کر گئی۔ شمس و قمر و نجوم، سیارے، سیارچے اور کہکشائیں وجود میں آئیں۔ یہ تب ممکن ہوا جب پہلے وجود کی تخریب ہوئی۔ اگر وہ تخریب نہ ہوتی تو کائنات کا اس صورت میں ڈھلنا جیسا کہ اس وقت موجود ہے، ناممکن تھا۔ جب وجود کا یہ بگاڑ کسی خاص مقصد کے تحت ہوا اور وہ مقصد حاصل ہو گیا جو خالق کا تھا تو اسے علامہ اقبالؒ نے جمالِ معنوی کا حصول قرار دیا۔ یعنی جمالِ معنوی کے حصول کے لیے فطرت میں خصومت و خونریزی کا یہ عمل ازل سے جاری ہے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ "اسرارِ خودی" میں وجود کے باہمی ٹکراؤ اور نتائج کی فطرت سے یوں مثال پیش کرتے ہیں:

بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کند — از پئے یک نغمہ، صد شیون کند
یک فلک را صد ہلال آوردہ است — بہرِ حرفے صد مقال آوردہ است
عذر ایں اسراف و ایں سنگیں دلی — خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی(۴)

یہ کلمات علامہ اقبالؒ نے بظاہر خودی کے اوصاف کے حوالے سے پیش کیے مگر اس میں فطرت کا وہ عظیم مقصد موجود ہے جو واضح قانون کی صورت رکھتا ہے۔ فطرت ایک تر و تازہ پھول لانے کے لیے پورے گلشن کو خزاں کا مزہ چکھا دیتی ہے۔ ایک صبح کو لانے کے لیے لاکھوں ستاروں کا خون کر دیتی ہے۔ ایک حرف کو وجود میں آنے کے لیے سیکڑوں آوازوں کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ یہ سب جمالِ معنوی کے حصول کی خاطر ہے جسے تخلیقِ کائنات یا جمالِ حقیقی کی تکمیل کا سفر کہا جا سکتا ہے۔(۵) پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> "کائنات کی تخلیق اس نہج پر کی گئی ہے کہ جہاں ہر جگہ خصومت اور خونریزی (جسے قرآن نے فسکِ دم سے تعبیر کیا) نظر آتی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت بظاہر ہر وقت غارت گری اور تباہ کاری پر کمربستہ ہے مگر اسی خونریزی سے جمالِ معنوی حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے یہ خونریزی بلاوجہ نہیں ہے"۔(۶)

اپنے اقتباس میں پروفیسر موصوف نے "فسکِ دم" کا حوالہ دیا ہے۔ اب اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے لیے القرآن الکریم سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ جب انسان کا وجود نہیں تھا۔ فقط نورانی مخلوق تھی اور عبادت کا فریضہ انجام دے رہی تھی تو "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" (۷) جیسی خواہش کے اظہار سے ہی تخریب کا عمل سامنے آیا اور ایک ایسی مخلوق وجود میں آئی جسے فرشتوں کا ضمیر ماننے کو تیار ہی نہ تھا۔ اس رائے کا جواز فرشتوں نے یوں طلب کیا" قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ "(۸) کہ یارب! تو ایسی مخلوق کیوں بنانا چاہتا ہے جو فساد کرے اور کشت و خون کرتا پھرے۔ بظاہر یہ انسان کی خامیاں بیان ہو رہی تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہہ کر انسان کی عظمت اور فطرت کے نامیاتی اصول پر ایسی مہر ثبت کر دی کہ تا وقتِ آخر اسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔

بات ذرا غور طلب ہے کہ واقعی انسان نے فساد برپا کیے اور ہابیل و قابیل کے اس پہلے حادثے سے ہی ایسا کرتا آرہا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی وکالت کیوں کی؟ اس کا مسلم الثبوت جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر وہ صفات رکھی ہیں کہ جن کو بروئے کار لا کر وہ اس کائنات کی تکمیل کرتا رہے گا۔ صفتِ خلاقی کا جو حصہ انسان کو عطا ہوا اس سے اس کائنات کی تکمیل ہوتی رہے گی اور جمالِ معنوی حاصل ہوتا رہے گا۔ علامہ اقبال نے اس پس منظر میں کہا:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے 'کُنْ فَیَکُوں' (۹)

یہ وہ رمز تھی جس سے فرشتے بے خبر تھے۔ انسان کس طرح کائنات کی تکمیل کرے گا۔ اس کے لیے انسان کا فسادی ہونا ضروری تھا۔ فساد اور خصومت کا جو مادہ انسان کو عطا ہوا اس کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نے دنیا میں نت نئے دائرے بنائے۔ مادی اور فکری سطح پر انقلابات لائے اور جدید سے جدید تر کی تلاش میں فرسودہ اشیاء کے وجود کو مٹاتا چلا گیا۔ ہر قدم پر زمین کی بدلتی ہیئتیں اسی فسکِ دم کا نتیجہ ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ فساد کا یہ عنصر انسان میں باعثِ خیر ہے یا شر؟ تو اس کے لیے قرآنِ مجید نے حدود مقرر کر دیں۔ اگر ان حدود کے اندر رہ کر اس صفت کو عملی جامع پہنایا جائے تو یہ خیر ہے اور حدود سے تجاوز کیا جائے تو یہ شر ہے۔ مثلاً اگر انسان ذاتی ہوس اور لالچ میں آکر دوسرے انسان کا گلا کاٹ دے تو یہ شر ہے اور قرآن نے اس کے لیے "قصاص" کی حد لگا دی۔ قصاص جان کے بدلے جان ہے۔ بظاہر عقل تو یہ مانتی ہے کہ ایک جان چلی گئی ہے تو دوسری کیوں جائے؟ یہ فساد ہے۔ مگر قرآن کہتا ہے: "وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰأُولِي الْأَلْبَابِ " (۱۰) عقل والوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے کہ تمہاری عقل اسے فساد سمجھتی ہے مگر قصاص میں تمہاری زندگی ہے۔ اسی طرح جب حق و باطل کا آمنا سامنا ہو تو تلوار سے منکرین کی جانوں کا ضیاع بظاہر فساد ہے مگر کتابِ لاریب اسے جہاد کہہ کر متبرک عمل قرار دیتی ہے۔ اگر انسان میں یہ ہمت اور خصومت و خونریزی کا یہ مادہ موجود نہ ہوتا تو فرشتوں کی طرح انسان کی بھی کوئی تاریخ نہ ہوتی۔ یفسک الدما کا وصف ہی کائنات کی تکمیل کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو دوٹوک جواب دے دیا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

اب ذرا فطرت کو دیکھیے کہ کس طرح جمالِ معنوی کی خاطر ایک شے دوسری شے کا خون کرتی ہے۔ "شرح اسرارِ خودی" میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں کہ تھوڑا سا مشک حاصل کرنے کے لیے بہت سے ہرنوں کا پیٹ بلا تامل چاک کر دیا جاتا ہے۔ ایک گملہ بنانے کے لیے بہت سے پودوں کو بے رونق کر دیا جاتا ہے۔ ایک چھوٹی سی آرزو کی تکمیل کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ کیا ہیلن اور سیتا کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں انسانوں کی قربانی نہیں دی گئی؟ کیا ایک سورج کو طلوع کرنے کی غرض سے فطرت لاکھوں ستاروں کا خون نہیں کرتی؟ ایک ڈگری حاصل کرنے کے لیے ایک طالب علم سیکڑوں راتوں کی نیند قربان نہیں کرتا؟ ایک موتی کی خاطر بعض اوقات سیکڑوں جانیں ضائع نہیں ہو جاتیں؟ (۱۱)

ان تمام مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ جب تک پہلے وجود میں تخریب نہ آئے نئی شے کا حصول ناممکن ہے۔ انسان کی رگِ فساد اس حد تک متحرک ہے کہ اس نے جنت کی نعمتوں کو اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے چھوڑ دیا۔ اپنا ارادہ ظاہر کرنے کے لیے جنت کا سودا اس قدر آسان نہ تھا۔ (۱۲) مگر انسان کر گزرا۔ دنیا میں آکر جہاں فطرت اسے شش جہات سے مغلوب رکھنا چاہتی تھی، انسان اس سے بغاوت کر بیٹھا اور اپنے طرزِ زندگی سے کائنات کو بس میں کرنا شروع کر دیا۔ یہیں سے انسان نے اپنے لیے مہذب ہونے کی اصطلاح استعمال کی۔ تہذیب تخریب کی منطقی صورت کا نام ہے۔ جب انسان نے فطرت میں بگاڑ پیدا کر دیا تو اس سے تہذیب وجود میں آئی۔ بقول زبیر رانا:

"انسان نے فطرت کے اس قانون کی نفی کرتے ہوئے جسے طاقتور کا قانون کہا جاتا ہے، جو بھی رہن سہن اختیار کیا، وہ کلچر یا رہتل کہلاتا ہے"۔ (۱۳)

فطرت کے قانون کی نفی کیا ہے؟ فطرت میں ایک زمین کا ٹکڑا بنجر ہے تو بنجر ہی پڑا رہے گا جب تک اس پر تخریبی عمل نہ ہو۔ جب انسان اس ٹکڑے میں کٹائی کر کے اس کی ظاہری شکل کو مکمل طور پر بگاڑ کر اس پر ایک عمارت کھڑی کر دیتا ہے تو یہی جمالِ معنوی کا حصول ہے۔ یہ عمارت انسان کی تہذیب یا تمدن کو ظاہر کرتی ہے، مگر وہ عمل جس سے یہ عمارت وجود میں آئی، زمین کے لحاظ سے تخریبِ تمام ہے۔ اپنے بیان کی توثیق میں آگے جا کر زبیر رانا لکھتے ہیں:

"رہتلی تاریخ ہمیں یقین دلاتی ہے کہ جنگل کی زندگی سے لے کر آج کی معاشرت تک جہاں بربریت کی بہت سی ماڈرن شکلیں موجود ہیں، انسان کا سفر فطرت کے اس قانون کی نفی کا سفر ہے جس کے تحت بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے"۔ (۱۴)

فطرت کے آگے سر جھکانے کی بجائے جب زندہ اجسام جہد للبقا میں زندگی کی راہیں بناتے چلے جاتے ہیں تو تخریبِ تمام اور تعمیرِ نو کی لاکھوں مثالیں جنم لیتی ہیں۔ قدرت کا موضوع چونکہ انسان ہے اس لیے تمام تر سوچ اور فکر سمٹ کر انسان پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ ایک طرف انسان ہے اور دوسری طرف کائنات کا وجود۔ اس دھرتی کی تخریب اور اس پر عمارات، باغات، مکانات اور دیگر تمام مادی و تخلیقی حوالے نفسِ انسانی کے ان تقاضوں کی تکمیل ہے جسے فرشتوں نے "یفسک الدما" کہا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے جس قدر تصورات پیش کیے، ہر تصور پر قدرتی حوالے موجود ہیں۔ جب راسخ الذہن شخص ایک طرف کتابِ لاریب کا مطالعہ کرتا ہے، دوسری طرف کتابِ فطرت سے عملی مثالیں دیکھتا ہے تو اقبالؒ کو شاعرِ فطرت کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک انسان یہ مان ہی نہیں سکتا کہ پہلا وجود برقرار رہے اور نیا وجود پیدا ہو جائے۔ اگر اس تصور کو مدِ نظر رکھا جائے تو قوموں اور نسلوں کا مٹنا اور نئی نسلوں کا پیدا ہونا جمالِ معنوی کی مثالیں ہیں۔ انقلاباتِ زمانہ سے ہی آثارِ زندگی وابستہ ہیں۔ یہ انقلابات اتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں کہ مذہب و اخلاق، تہذیب و تمدن، اقتصادیات و معاشرت غرض انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو اس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ایک قوم تباہ ہوتی ہے تو دوسری اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اپنی جدت پسندیوں کے زور سے وہ ایک جدید نظامِ حیات کی بنیاد ڈالتی ہے۔ وہ اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے بھی نیا اسلوبِ بیان اور نئے الفاظ وضع کرتی ہے یا اپنے ساتھ لاتی ہے۔ (۱۵) تاریخ میں ہمیشہ اسے دنیا کی بے ثباتی قرار دیا گیا کہ یہاں کسی شے کو مستقل صورت حاصل نہیں ہے۔ مگر علامہ اقبالؒ نے اسی تغیر کو حصولِ جمال قرار دیتے ہوئے ساقی نامہ میں نقشِ حیات کی دلیل قرار دیا:

گُل اس شاخ سے ٹُوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھُوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — اُبھرتا ہے مِٹ مِٹ کے نقشِ حیات (۱۶)

گلوں کا شاخ سے ٹوٹنا اور اسی شاخ سے پھوٹنا تخریب و تعمیر کے واضح اشارے ہیں۔ اسے دنیا کی بے ثباتی تصور کرنا محض نظر کا دھوکہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے تخریب و تعمیر کے اس تصور کو اور بھی واضح کر رکھا ہے۔ جنگلوں کا قتلِ عام اور عمارات کی تعمیر نے زمین کی ہیئت میں جو تبدیلیاں لائی ہیں، ایک طرف تخریبِ تمام ہے تو دوسری طرف جہانِ نو کی تعمیر ہے۔ اسے ہی تکمیلِ جمال کہا گیا۔ 'آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون' سے ٹھیک اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ واضح ہوا کہ کائنات کی داخلی حقیقت حرکت ہے۔ سکون کسی شے کو حاصل نہیں۔ اسی حرکت سے

وجود میں انقلابات رونما ہوتے ہیں۔ بظاہر ایک شے نظامِ ہست و بود کو درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے مگر اس کے نتیجے میں جو حاصل ہوتا ہے وہی حسنِ فطرت ہے۔ بقولِ اقبالؒ:

؎ گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود
ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود
زلزلے سے کوہ و دَر اُڑتے ہیں مانندِ سحاب
زلزلے سے وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود[۱۷]

اس سے بڑھ کر تخریب برائے تعمیرِ نو کی اور کیا دلیل ہو گی کہ ایک طرف زلزلہ زمین کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے اور دوسری طرف اسی سے زمین میں تازہ چشمے پھوٹتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فطرت میں موجود تخریب کا یہ عنصر ہی ہے جس سے حسن و جمالِ وجود قائم ہے۔ مختلف شعبہ ہائے حیات میں تخریبِ تمام کا جائزہ یوں لیا جا سکتا ہے:

تخریبِ تمام کا مذہبی پس منظر:

مذہب اور انسان کا رشتہ ازلی ہے۔ تخلیقِ آدم سے ہی ذاتِ حق کی طرف سے جو قانونِ حیات انسان کو ملا اور اس پر کاربند رہنے کی ہدایت ہوئی وہ انسان کا مذہب ٹھہرا۔ اس قانون میں انسان کی طرف سے بگاڑ آیا تو حق و باطل کے درمیان فصیل قائم ہوئی۔ انسان سیدھے راستے سے بھٹک گیا تو دنیا میں فرعونوں و نمرودوں جیسی جھوٹی خدائیاں قائم ہوئیں۔ نمرودوں و فرعونوں ایک طرف دینِ متین میں بگاڑ تھا۔ یہ تخریب ایک معنوی حسن لے کر آئی کہ اس نے حق پر چلنے والوں کو باطل سے بالکل منفرد کر دیا۔ جب خدائی کے باطل مسند پر فائز فرعونیت پر موسوی عصیٰ کی ضرب لگی تو اس باطل وجود کو حقیقی و نورانی وجود کے سامنے نیست و نابود ہونا پڑا۔ فرعونی خدائی میں ظاہر ہونے والی اس تخریب کا نتیجہ حق کی سرخروئی نکلا۔ یہی صورتحال نمرودی طاقت کے ساتھ پیش آئی۔ یہ شکل فرعونیت سے زیادہ مہیب تھی۔ یہاں بت شکنی اور آتش زدگی جیسے عوامل نگاہِ ہستی کو خیرہ کرتے دکھائی دیے۔ یہاں تخریب کا آغاز بت شکنی سے ہوا۔ خلیلِ خداؑ کو آگ کے دھکتے شعلوں کی خوراک بنا کر پیش کیا مگر اس تخریب کا نتیجہ " قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ "[۱۸] کے طور پر سامنے آیا۔ یہ ذاتِ واحد پر مکمل ایمان و یقین کی نئی تعمیر تھی کہ چشمِ عالم نے چالیس دن تک ایک انسان کو دھکتی آگ میں خوش و خرم پایا۔ پھر جب عصائے تخریب کا رخ نمرود کی طرف ہوا تو اس نے نمرودی خدائی کا سر پھوڑ ڈالا۔ یہ ایک ایسے نظامِ حیات کا خاتمہ تھا جو باطل تھا اور جمالِ معنوی کی صورت میں نتیجہ حق کی فتحِ مبین کے طور پہ ظاہر ہوا۔

یہی صورتحال حجازِ مقدس میں نبیٔ آخر الزماں ﷺ کے ساتھ پیش آئی اور ابولہب اور ابوجہل جیسی طاقتوں سے ٹکراؤ ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مشرکین نے جتنی تخریب کاریاں کیں دینِ حنیف اتنا ہی نشو و نما پاتا رہا اور آخر کار " اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا "[۱۹] کا اعلان ہو گیا۔ غرض یہ کہ حضرت آدمؑ سے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک مذہب میں کئی طرح سے تخریب کاری ہوئی مگر پہلے سے زیادہ طاقت کے ساتھ حق ابھرا۔ ثابت ہوا کہ تعمیرِ نو کے لیے تخریب کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔

اب قیامت تک کوئی آسمانی کتاب آنے والی نہیں۔ اس لیے ہر قدم پر قرآن کی رہنمائی ناگزیر ہے۔ قرآن کریم نے تخریب کا یہ تصور انتہائی خوبصورتی کے ساتھ واضح کیا۔ پہلے فطرت سے مثال پیش کی: " فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَ جَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ حُسْبَانًا "۔[۲۰] غور کیجیے کہ دن کو رات سے کھینچ کر نکالا ہے۔ ظاہر ہوا کہ رات کی تخریب، دن کی تعمیر ہے۔ ستاروں کی تخریب سورج کی تعمیر ہے۔ چاند کی موت

سورج کی نمود اور سورج کی نزع چاند کی پیدائش ہے۔ کائنات کے ظاہری وجود پر غور کرنے کے بعد جب قرآن نے یہ کہا" وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ"۔ (۲۱) تو یہ تخریب کی واضح صورت سامنے آئی۔ کائنات کی ہر شے کو انسان کے بس میں کر دیا ہے۔ اب سوچنا یہ ہے کہ قدرت کو جب بس میں کر دیا ہے تو انسان اس قابلیت کو حاصل کیسے کرے؟ بنا تخریب کے ایسا ممکن ہی نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے تخریب کے تمام ہتھکنڈوں کو اپنا کر جمالِ معنوی کے حصول کو ممکن بنایا ہے۔ زمین کا سینہ پھاڑ کر چھپے خزینوں تک رسائی حاصل کرنا، سمندوروں کے کلیجے چیرنا، خلاء کے غلافوں کو چاک کرنا اور منزلِ مقصود تک پہنچنا تخریبِ تمام برائے تعمیرِ نو ہی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بہت جلد ہم اس انسان کو کائنات میں اور خود اس کے وجود کے اندر چھپی تمام نشانیوں سے آشنا کر دیں گے، یہاں تک کہ انسان اللہ کے حق ہونے پر گواہی دینے لگے گا (۲۲) تو اس مقام کو آج کی تجربی دنیا پا چکی ہے اور مزید کھوج رہی ہے۔ جب تک زندگی کا ایک حصہ اس میں ضائع نہ کر دیا جائے یہ جمالِ معنوی حاصل نہیں ہو سکتا۔

تخریب کا تہذیبی پس منظر:

بین السطور گزر چکا کہ دھرتی پر انسانی تہذیب کا آغاز قانونِ فطرت سے بغاوت کے ضمن میں ہوا۔ یہی حوالہ ہے اس بیانیے کا کہ تہذیب دراصل تخریب کا نتیجہ ہے۔ تہذیب کسی شے کو بنانا اور سنوارنا ہے جبکہ تخریب بگاڑ ہے۔ دونوں میں پھر رشتہ کیسے قائم کیا جا سکتا ہے؟ یہی وہ نقطہ ہے جو مشکلاتِ زندگانی کی کشود ہے۔ انسان نے تہذیبی سفر پتھر سے کانسے اور کانسے سے لوہے، تین منازل میں طے کیا۔ جب پتھر کی تہذیب پر زوال آیا تو نتیجہ کانسے کا دور تھا۔ یعنی کانسے کا عروج۔ اسی طرح کانسے کی تہذیب کا زوال لوہے کی تہذیب کا عروج تھا۔ یعنی ایک طرف بگاڑ تو دوسری طرف تعمیرِ نو۔

عالمی تہذیبوں کا جائزہ لیا جائے تو سمیری اور مصری تہذیبیں دنیا کی قدیم ترین تہذیبیں تھیں۔ پھر اس کے بعد ہڑپا اور موہنجو داڑو کی تہذیبوں کے مٹنے سے ہی انسان نے نئی اور جدید تہذیب میں قدم رکھا۔ بات ہندوستان کی آئے تو آریاؤں سے قبل جو دراوڑ قبائل آباد تھے ان کی تہذیب پر آریائی تخریب سے زوال آیا اور مادر سری نظام سے یہ لوگ پدر سری نظام میں داخل ہوئے۔ اسی طرح طبقاتی حلقہ بندی وجود میں آئی۔ ذات پات کا نظام بنا اور ایک نئی تہذیب نے سر اٹھایا۔ دوسری طرف قبل از اسلام عربوں کی تہذیبی حالت یہ تھی:

کہیں تھا مویشی چرانے پہ جھگڑا — کہیں پہلے گھوڑا بڑھانے پہ جھگڑا
لب جو کہیں آنے جانے پہ جھگڑا — کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا

یوں ہی روز ہوتی تھی تکرار ان میں
یوں ہی چلتی رہتی تھی تلوار ان میں (۲۳)

جب اس تہذیب میں اسلام کا سورج طلوع ہوا تو عربوں کے روایتی طرزِ زندگی پر زوال آیا۔ نتیجے میں نئی اسلامی تہذیب منظرِ عام پر آئی جس نے فقط عرب ہی نہیں بلکہ عالمی سطح ہر ہر معاشرے کو متاثر کیا۔ وہ ثقافت جس میں خون بہانا فخر تھا۔ اسلام نے اس ثقافت میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ اس تخریب نے نئی تہذیب کو جنم دیا۔ خون کے پیاسے عزتوں کے محافظ بن گئے۔

ایسا ہی بگاڑ یورپ کی تہذیبی زندگی میں رونما ہوا۔ اس وقت یورپ مادی سفر میں دنیا کا امام ہے، مگر اس کی تاریخی صورت اتنی اجلی نہیں ہے۔ ایک وہ دور تھا جب پاپائیت کا راج تھا۔ سائنسی علوم کے حصول پر مذہبی پابندی تھی۔ فطرت میں تبدیلی لانا پاپ تھا۔ اہلِ کلیسا نے تجربی

علوم کا حصول حرام قرار دے رکھا تھا۔ بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق، قدیم زمانے میں یورپ مختلف وحشی قبائل کا مسکن تھا۔ بحیرۂ اسود کے شمال اور دریائے دنیپر DNIEPER کے دونوں طرف گاتھ آباد تھے۔ مغرب میں ہنز رہتے تھے۔ جرمنی تین خونخوار قبائل یعنی، وینڈلر، سیکسنز اور اینگلز کا وطن تھا۔ جنوبی جرمنی اور شمالی اٹلی میں لمبرڈز سکونت پذیر تھے۔ فرانس میں فرانک اور برطانیہ میں سلٹ SELTS رہتے تھے۔ یورپ کے باقی حصوں میں بھی اجڈ قبائل آباد تھے۔ جن کا کام لڑنا بھڑنا اور ڈاکے ڈالنا تھا۔ (۲۴)

اس تہذیب کا بگاڑ کیسے ممکن ہوا؟ یہ تخریبِ تمام کی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔ عرب میں جب اسلامی تہذیب نے عروج پکڑا تو یہ ایسا روشن چراغ ثابت ہوئی جس نے بے شمار شمعیں اور جلائیں۔ علم و فن کو عام کیا۔ اندلس اور افریقہ تک علوم کے دریا بہائے۔ بقول ڈاکٹر غلام جیلانی برق:

> "گیارہویں صدی میں اسلامی تہذیب، تمدن اور علوم و فنون مختلف راستوں سے یورپ میں پہنچے اور وہاں کی تاریکیوں میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ پانچ چھے صدیوں کے بعد وہاں اجالا سا ہونے لگا۔ جابجا مدارس کھل گئے۔ تالیف و ترجمے کے ادارے قائم ہو گئے۔ عربی علوم کے تراجم ہونے لگے۔ پاپائیت کا زور ٹوٹ گیا۔ مذہبی اوہام و اباطیل کے محل مسمار ہو گئے۔ جاگیر دارانہ نظام مٹ گیا۔ اسی دور میں برطانیہ (۱۶۸۸ء) فرانس (۱۷۸۹ء) اور امریکہ (۱۷۷۶ء) میں انقلابات آئے اور انسانی فکر، شخصی حکومت اور کیلسیائی بندشوں سے آزاد ہو گئی اور یہ تھا یورپ کا آغازِ عروج"۔ (۲۵)

اس بیانیے کی ہر سطر تخریب کی طرف اشارہ ہے۔ یورپ کا عروج دراصل اس تہذیب میں بگاڑ کا نتیجہ ہے جو عہدِ قدیم سے چلی آ رہی تھی۔ اگر اس تہذیب میں بگاڑ نہ آتا تو یورپ آج تک پاپائیت میں پس رہا ہوتا اور تخلیق و ہنر مندی کے جتنے نمونے دنیا میں چھوڑ چکا ہے یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

ٹھیک اسی طرح روم و فارس پر اسلامی تہذیب کا جھنڈا لہرایا تو ان تہذیبوں کے مٹنے سے تمدن کے نئے انداز وجود میں آئے۔ ایران اسلامی ثقافت کا گہوارہ بنا اور ہندوستان تک اس کی گود میں آ گیا۔ جب عربوں نے ہندوستان فتح کیا تو یہاں کی ہندی تہذیب میں تخریب کا بیج بویا گیا۔ نتیجے میں ایک ایسی ثقافت پروان چڑھی جو اپنی ہیئت کے اعتبار سے پہلی ثقافت سے افتراق و مماثلت جیسا وصف رکھتی تھی۔ مسلمان اپنے ساتھ تین بڑی زبانیں لے کر آئے۔ عربی، ترکی اور فارسی۔ ان زبانوں نے یہاں کی مقامی بولیوں پر اثر ڈالتے ہوئے ان میں بگاڑ پیدا کیا۔ اس سے نئی زبان ہندی بنی اور پھر اردو ہندی کی تقسیم ہوئی۔ یہ جمالِ معنوی کا حصول تھا۔ اگر یہ زبانیں سنسکرت یا مختلف پراکرتوں پر اثر انداز نہ ہوتیں اور تخریب کا عمل نہ ہوتا تو نئی زبانیں وجود میں نہیں آ سکتی تھیں۔

انگریزی یلغار نے عظیم مغلیہ تہذیب کو تخریب سے دوچار کیا۔ لباس و پوشاک اور طرزِ معاشرت کے تمام عوامل کو بگاڑ کے امتحان میں ڈال دیا۔ یہ مغلیہ ثقافت کا بگاڑ تھا نتیجے میں ایسی تہذیب نے جنم لیا جو کہ وقت کا تقاضا تھا۔ علم و ہنر کے نئے دریچے کھلے۔ اس سے پہلے تعلیم کا جو رواج تھا اس میں عام مکتب کی تعلیم نہ تھی۔ انگریزوں نے جدید تعلیمی نظام کا بیج بویا۔ اس وقت اس خطے میں مختلف تعلیمی ادارے الذی علم بالقلم کی تفسیر پیش کر رہے ہیں۔ اسی طرح تحقیق کے راستے کھلے اور اس خطے نے سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ یہ جمالیاتی پہلو روایت کی تخریب سے ہی حاصل ہوا۔

غرضیکہ ثقافتی پس منظر میں تخریب برائے تعمیرِ نو کا عنصر اس تصور کو ثابت کرنے کا عملی حوالہ ہے۔ ثقافت انسان کی ایجاد ہے اور انسان کو خالق ہونے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے بخش رکھی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کئی ایک مقامات پر انسان کے اس وصف کو الفاظ کی شکل دی

ہے۔ نظم "محاورہ مابین خدا و انسان" کا اسی پس منظر سے مطالعہ کیا جائے تو انسان کے اندر سفکِ دم کا عنصر تخریب برائے تعمیرِ نو کی دلیل بن کر واضح ہو جاتا ہے۔ خدا بندے سے مخاطب ہے:

جہان را ز یک آب و گل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خال پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی
تبر آفریدی نہالِ چمن را — قفس ساختی طایرِ نغمہ زن را[۲۶]

غور کیجیے! یہ تمام باتیں انسانی ثقافت سے متعلق نہیں ہیں؟ انسان کا قوموں میں بٹ کر رہنا، ہتھیار بنانا، مختلف آلات بنانا، یہ سب تہذیبی حوالے ہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرت کو جس نہج پہ پیدا کیا ہے اس سے انسان نے بغاوت اختیار کی تو تہذیبِ انسانی وجود میں آئی۔ انسان میں تخریب کا عنصر ہی اس کی بنا بنا۔ لوہا ایک خام مال ہے جسے کیمیاء Raw material کہتی ہے۔ اس کی فطرت ہے کہ یہ خام ہی رہے گا۔ انسان نے اس سے بغاوت کی۔ اس کی فطری حالت میں بگاڑ لایا تو جمالِ معنوی کے طور پر کلہاڑی، چھری، تلوار، تبر، نیزہ، کدال، غرض بے شمار اشیا جو روزمرہ زندگی میں نظر آتی ہیں جو کہ انسانی تہذیب کا حصہ ہیں، سامنے آئیں۔ دوسری مثال درخت کی لیجیے۔ اس کی فطرت ہے کہ زمین میں کھڑا رہے گا۔ انسان نے بغاوت کی۔ اسے کاٹ دیا اور اس سے مختلف قسم کا عمارتی سامان تیار کیا۔ یہی عمارتی سامان انسانی تہذیب کا حصہ بنا۔ تخریب و تعمیر کے اس سلسلے کو کہیں بھی روکا نہیں جا سکتا۔ انسان اپنی اس فسادی طبیعت سے بالکل آشنا ہے اور خدا سے مخاطب ہو کر اپنی خلاقیت کا اظہار یوں کرتا ہے:

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم[۲۷]

فطرت نے رات کو وجود دیا۔ انسان نے مٹی اور تیل کے ذخیرے سے اندھیرے کو مٹانے کی کوشش کی۔ چراغ کی ارتقائی صورت مختلف برقی آلات میں ظاہر ہوئی۔ اس وقت انسان زمین کے وجود کو کاٹ کر دریاؤں کے رخ اپنی مرضی سے موڑتا ہے اور مناسب جگہوں پر ڈیم بنا کر بجلی پیدا کرتا ہے۔ اگر اسے انسان کی فسادی طبیعت کا جمالیاتی پہلو کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

اقبالؒ کے تصورِ خودی اور عشق میں تخریب کا عنصر:

علامہ اقبال کے تصورِ خودی اور تصورِ عشق دونوں میں تخریب برائے تعمیرِ نو کا عنصر موجود ہے اور خودی و عشق کے داخلی اوصاف میں اسے منفرد حیثیت حاصل ہے۔ خودی ذات کی نمود کا نام ہے۔ اس غرض سے ہر آن وہ مدِ مقابل سے ٹکراتی رہتی ہے۔ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے خصومت و خونریزی کی زندہ مثال بن جاتی ہے۔ بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی:

> "خالقِ خودی نے خودی کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ جنگ و جدل میں مصروف رہتی ہے۔ مقابلہ اور خصومت پر کمربستہ نظر آتی ہے۔ کس لیے؟ تاکہ جمالِ معنوی کی تکمیل ہو سکے"۔[۲۸]

پروفیسر موصوف نے یہ تصور علامہ اقبالؒ کی نظم ساقی نامہ سے اخذ کیا ہے:

بڑی تیز جولاں، بڑی زود رس	اَزل سے اَبد تک رمِ یک نفَس
زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے	دَموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے
خودی جلوہ بدمست و خلوَت پسند	سمندر ہے اک بُوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے، اَبد سامنے	نہ حد اس کے پیچھے، نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی	ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں	پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں (۲۹)

ان اشعار میں علامہ اقبال نے تسلسل کے ساتھ خودی کے اندر موجود لڑنے بھڑنے اور مدِ مقابل سے ٹکرا کر اپنی انفرادیت بر قرار رکھنے کی صفت کو اجاگر کیا ہے۔ فطرت میں موجود ہر شے اس صفت سے دوچار ہے۔ بہتے پانی کی خودی ہے کہ وہ راستے میں آنے والی ہر شے سے ٹکراتا ہے، رکتا نہیں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے اور خس و خاشاک کو بہالے جاتا ہے۔

عشق، اقبالؒ کے ہاں مقاصد کی تخلیق و حصول ہے۔ جب مقصد تخلیق ہو تو اس کو حاصل کرنے کی ساری تگ و دو تخریب و تعمیر کا لامتناہی سلسلہ بن جاتا ہے۔ شق القمر ایک طرف چاند کی ہیئت میں بگاڑ کی مثال تھی تو دوسری طرف معجزۂ رسول ﷺ کا بین اظہار۔ خدائے تعالیٰ کا مقصد معجزہ دکھانا تھا لہٰذا مقصد کی تخلیق ہوئی۔ حصول کے طور پر چاند کو دو ٹکڑے ہونا پڑا۔ تخلیق و حصول کے اس مکمل عمل کو عشق کہا جاتا ہے۔ کائنات کی تخلیق کا یہی تصور جلال الدین رومی نے پیش کیا(۳۰) آغازِ سطور میں کہا گیا کہ زمین و آسمان کو جدا کرنا اور کائنات کو وجود بخشنا جو کہ تخریب کی دلیل تھی۔ یہاں اس کی سند ملتی ہے کہ اس کے پس منظر میں جذبۂ عشق کار فرما ہے۔ عشق کو اقبالؒ نے وہ فلسفیانہ معنی عطا کیے ہیں کہ یہ کائنات کی ابتدا و انتہا کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔ اقبال کا کمال ہے کہ انھوں نے پرانے تصورات کی تجدید کی اور نئے معنی عطا کیے۔ خود کہتے ہیں:

مرا معنیِ تازہ ئی مدعاست
اگر گفتہ را باز گویم رواست(۳۱)

تخریبِ تمام اور عقدۂ قیامت کی کشود

علامہ اقبال نے شعر کے دوسرے مصرعے میں "ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود" قیامت برپا ہونے کی ایسی منطقی دلیل پیش کر دی کہ جب اس کی شرح ہو تو کئی ایک عقائد کی عقلی توثیق ہو جاتی ہے۔ انسان پر افشا ہو جاتا ہے کہ جس چیز کو وہ دنیا کی بے ثباتی کہہ کر کمزور ثابت کرنا چاہتا ہے، دراصل یہی مقصدِ قدرت ہے اور اسی اصول پر فطرت کی تشکیل ہوئی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کائنات کی وہ صورتِ منتہا کہ جہاں تک اسے پہنچنا ہے وہ ظاہر ہی نہ ہو۔ وجودِ کائنات کو اپنی آخری صورت میں ڈھلنا ہے۔ جب اس کا سفر مکمل ہو گا تو پھر اس سے اگلا قدم مابعد طبیعیاتی ہے۔ یعنی یومِ آخرت کا سورج تب طلوع ہو گا۔ اس سفر میں اگر کسی شے کو دوام حاصل ہو جائے تو حسنِ فطرت غائب ہو جائے گا۔ انسان کی مثال لے لیجیے۔ اگر ایک ہی قوم ازل سے ابد تک موجود ہوتی، مٹنے اور بننے کا عمل نہ ہوتا تو کیا اس دنیا سے انسان کا دل اچاٹ نہ ہو گیا ہوتا؟ پھر اگر تخریب کی یہ صورت نہ ہوتی تو جنت و جہنم کے فیصلوں کی نوبت کیسے آتی؟ جب یوم آخرت پر ایمان لایا جا چکا ہے تو اس کی منطقی دلیل بھی یہی بنتی ہے کہ آخرت کا ظہور تب ممکن ہے جب یہ مادی وجود مٹ جائے۔ اس وجود پر تخریبِ تمام کا عمل ہو گا تو جہانِ آخرت ظہور میں آئے گا۔

کائنات کا مادی وجود مٹنا اقبالؒ کے نزدیک المیہ نہیں بلکہ جمالِ معنی کے حصول کا ذریعہ ہے اور مشکلاتِ زندگانی کی کشود اسی میں ہے۔ تھوڑا قرآنِ مجید پر تدبر کیا جائے کہ قرآن قیامت کا منظر کیسے پیش کرتا ہے؟ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا [۳۲] ابتدا زلزلے سے ہو گی۔ پھر اس کے بعد وجود کے مٹنے کا ہیبت ناک منظر یوں پیش ہوا:

" اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۔ وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۔وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ۔ وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ"[۳۳]

کس قدر ہیبت ناک الفاظ ہیں کہ جب آسمان پھٹ جائے گا اور ستارے ٹوٹ جائیں گے اور دریا بہہ کر ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے۔ اسی طرح کا ہولناک منظر سورۂ قارعہ میں بیان ہوا:

" يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ۔ وَ تَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ"[۳۴]

یہ وہ دن ہو گا جب لوگ بکھرے ہوئے تنکے لگیں گے۔ پہاڑ ایسے ہوں گے جیسے دھنکی ہوئی رنگ برنگ اون۔ اب غور کیجیے کہ ایک طرف قیامت کا ہولناک منظر بیان ہوا۔ دوسری طرف اس عمل سے میدانِ آخرت کے وجود میں آنے کا بیان بھی مسلم ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو کیا جہانِ آخرت وجود میں آسکتا ہے؟ بالکل بھی نہیں۔ ثابت ہوا کہ قیامت کے ظہور کے لیے کائنات کے وجود کو مٹنا ہے اور یہ کیسے مٹے گا؟ اس کا جواب قرآنِ مجید نے دے دیا کہ یہ وجود مٹ کر رہے گا۔ آخرت جس پر ہر مسلمان کا ایمان ہے اس کے آنے کے لیے اس وجود کا مٹنا ہی منطقی دلیل ہے اور یہ دلیل اقبالؒ نے اپنے تصورِ تخریبِ تمام میں بدرجۂ اتم پیش کر دی۔ جس چیز کو انسان عذاب تصور کرتا ہے، یہ تخریب، تعمیرِ قیامت کی منطقی بنیاد ہے۔ اس تمام پس منظر کو سامنے رکھ کر اقبالؒ نے کہا کہ تخریبِ تمام ہی مشکلاتِ زندگی کی کشود ہے۔ الغرض ارمغانِ حجاز (اردو) میں شامل اقبال کا یہ شعر ایک فارمولا ہے جس سے انسان کے ذہن سے کئی ایک ایسے تصورات مٹ جاتے ہیں جو بظاہر طبعِ انسانی کے لیے موزوں نہیں، مگر حقیقت میں وہ شے مقاصدِ فطرت میں شامل ہے اور اسے فطری انداز سے قبول کرنے میں ہی ذہنی و قلبی تسکین ہے۔

- **تصورِ تخریبِ تمام اور عہدِ حاضرہ کی فکری رہنمائی**

علامہ اقبالؒ نے تخریبِ تمام کا فلسفہ اپنے اشعار میں پیش کر کے قوم کی اس حوالے سے رہنمائی کی ہے کہ قدرتی و انسانی آفات کے پھوٹ پڑنے سے کہیں فکری انتشار اور افراتفری کا شکار نہ ہو جائے۔ خصومت و خونریزی کا عنصر بظاہر بگاڑ ہی لگتا ہے مگر نظر نتیجے پہ رکھنی ہو گی کہ مستقبل میں کون سی ثقافتی یا تمدنی صورت وجود میں آسکتی ہے۔

اس وقت قوم عہدِ انتشار سے گزر رہی ہے۔ ذہنوں کو واضح رہنمائی نہ ملنے کے سبب سیاسی و سماجی سطح پر بھٹکنے کی سیکڑوں مثالیں سامنے آ چکی ہیں۔ یہی وہ موڑ ہے جس پر ہمیں اکابرین کی طرف نگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سیاسی بگاڑ نے امت کو پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ یہاں ایک نوجوان ذہن کو استقلال کے ساتھ سوچنا پڑے گا کہ وہ جذبات میں بہہ کر کہیں سببِ انتشار تو نہیں بن رہا۔ اگر ایسا ہے تو رجوع کرنے میں دیر نہ کی جائے۔ زمانے کے فکری و مادی انقلابات سے سبق ضرور حاصل کیا جائے مگر اذہان و قلوب پہ ان اثرات کو حاوی کر کے دب نہیں جانا چاہیے کہ اپنا راستہ چھوڑ کر اغیار کی پیروی اختیار کر لی جائے۔ اسی انتشار اور بگاڑ میں اپنے تصورات و خیالات کو منفرد انداز سے پروان چڑھانے اور قومی خدمت میں لگائے رکھنے میں ہی نجات ہے۔ یہود و نصاریٰ اس وقت ہزاروں حیلوں سے مشرقی نوجوان کو راہِ استقلال سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ ایسا تب تک ممکن ہی نہیں جب تک مشرقی نوجوان فلسفۂ تخریب کو سمجھتے ہوئے تمام حیلوں اور بہانوں سے آزاد اپنی راہ پر گامزن رہے گا۔ افغان قوم میں اس بیانیے کا زندہ ثبوت دیکھا جا سکتا ہے۔ بیس سال کی مسلسل خصومت و خونریزی کے بعد اپنے راستے پہ مستقل چلتے ہوئے اغیار کے ظلم سے نجات پا کر اس

وقت وہ قوم امن کی زندہ مثال بن چکی ہے۔ یہ امن اور اسلامی روایات کا احیا اس بگاڑ سے حاصل ہوا جو ایک لمبے عرصے تک ان زمینوں پہ موجود تھا۔ اسی طرح مسلمان قوم کو جگہ جگہ ایسے بگاڑ کا سامنا ہے جس سے محفوظ رہنے کا واحد کلیہ تصورِ تخریب کو جان کر اپنے افکار کے زاویے درست رکھتے ہوئے مستقل مزاجی سے منزل کی جانب رواں دواں رہنا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال (لاہور: سعد پبلی کیشنز، س ن)، ص ۶۷۷

۲۔ وارث سرہندی (مؤلف)، علمی اردو لغت (لاہور: علمی کتاب خانہ، س ن)، ص ۴۲۹

۳۔ القرآن الکریم، ۲۱:۳۰

۴۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح اسرارِ خودی (لاہور: اقبال اکادمی، س ن)، ص ۱۷

۵۔ حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر، شرح کلیاتِ اقبال (فارسی) (لاہور: مکتبۂ دانیال۔ س ن)، ص ۳۲

۶۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح اسرارِ خودی، ص ۲۴

۷۔ القرآن الکریم، ۲:۳۰

۸۔ القرآن الکریم، ۲:۳۰

۹۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۳۷۶

۱۰۔ القرآن الکریم، ۲:۱۷۹

۱۱۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح اسرارِ خودی، ص ۲۵

۱۲۔ القرآن الکریم ۱۴-۷:۹

۱۳۔ زبیر رانا، داستانِ ثقافت، جلد اول (لاہور: مصباح سنز، ۱۹۸۸ء)، ص ۱۳

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۵۔ غلام سرور فگار، دیباچہ شرح اسرارِ خودی از پروفیسر یوسف سلیم چشتی، ص ۸-۹

۱۶۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۶۷

۱۷۔ ایضاً،

۱۸۔ القرآن الکریم، ۲۱:۶۹

۱۹۔ القرآن الکریم، ۵:۳

۲۰۔ القرآن الکریم، ۶:۹۶

۲۱۔ القرآن الکریم، ۴۵:۱۳

۲۲۔ القرآن الکریم، ۴۱:۵۳

۲۳۔ الطاف حسین حالی، مسدسِ حالی (لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، س ن)، ص ۱۴

۲۴۔ غلام جیلانی برق، ڈاکٹر، یورپ پر اسلام کے احسان (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن)، ص ۳۶

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ اقبال، علامہ، پیامِ مشرق (لاہور: نقوش پریس، طبع دوم، ۱۹۹۴ء)، ص ۹۳

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر، شرح اسرارِ خودی، ص ۲۵

۲۹۔ اقبال، علامہ، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۴۶۸

۳۰۔ محمد شریف بقا، موضوعاتِ خطباتِ اقبال (لاہور: اقبال اکادمی، طبع اول، ۲۰۰۶ء)، ص ۱۳۶

۳۱۔ اقبال، علامہ، پیامِ مشرق، ص ۹۱

۳۲۔ القرآن الکریم، ۱:۹۹

۳۳۔ القرآن الکریم، ۱:۸۲

۳۴۔ القرآن الکریم، ۴:۱۰۱

منابع و مراجع

- القرآن الکریم
- صحیح البخاری
- صحیح المسلم
- سنن ترمذی
- اقبال، علامہ۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال (جلد اول)، مرتبہ سید مظفر حسین برنی۔ دہلی: اردو اکادمی، بار چہارم ۱۹۹۳ء
- اقبال، علامہ۔ کلیاتِ اقبال (اردو)۔ لاہور: سعد پبلی کیشنز، س ن
- اقبال، علامہ۔ کلیاتِ اقبال (فارسی)۔ لاہور: نقوش پریس، اشاعت چہارم، ۱۹۹۴ء
- الطاف حسین حالی۔ مسدسِ حالی۔ لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ، س ن
- حمید اللہ ہاشمی، پروفیسر۔ شرح کلیاتِ اقبال (فارسی)۔ لاہور: مکتبہ دانیال، س ن
- زبیر رانا۔ داستانِ ثقافت، جلد اول۔ لاہور: مصباح سنز، ۱۹۸۸ء
- عبد السلام ندوی، اقبالِ کامل۔ اعظم گڑھ: دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۹ء
- غلام جیلانی برق، ڈاکٹر۔ یورپ پر اسلام کے احسان۔ لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن
- غلام سرور فگار۔ دیباچہ شرح اسرارِ خودی از پروفیسر یوسف سلیم چشتی
- غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر۔ اقبال اور قرآن۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع چہارم، ۱۹۹۸ء
- محمد شریف بقا۔ موضوعاتِ خطباتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی، طبع اول، ۲۰۰۶ء
- محمد یوسف خان سلیم چشتی، پروفیسر۔ شرح اسرارِ خودی۔ لاہور: اقبال اکیڈمی۔ س ن
- وارث سرہندی (مؤلف)۔ علمی اردو لغت۔ لاہور: علمی کتاب خانہ، س ن
- وحید الدین، فقیر، سید۔ روزگارِ فقیر، لاہور: لائن آرٹ پریس لمیٹڈ، بار چہارم، ۱۹۶۴ء